ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1906

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY, ISLAMABAD

کورس :تاریخ افکار و علوم اسلامی(1906)

سطح :بی ایس علوم اسلامیه

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر) 1 یونٹ نمبر(5-1

کل نمبر | 100 . کامیابی کے نمبر50 :

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(For Study & Reference)

نوٹ :یہ حل شدہ مشق صرف مطالعے اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طالبہ سے گزارش ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس کا باقاعدہ مطالعہ کریں، مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر جوابات اپنی زبان اور اپنے الفاظ میں لکھیں۔

سوال نمبر1 ۔ علم کا مفہوم واضح کریں، نیز قرآن اور حدیث کی رُو سے علم کی اہمیت و فضیلت پر روشنی ڈالیں۔ 20) نمبر(

تعارف

علم انسانی زندگی کی وہ بنیادی قوت ہے جو انسان کو دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ انسان کی تخلیق، اس کی خلافتِ ارضی اور اس کی تمام ترقی و تہذیب کا دارومدار علم ہی پر ہے۔ اسلام نے علم کو محض معلومات کا ذخیرہ نہیں سمجھا بلکہ اسے نور، ہدایت اور زندگی قرار دیا ہے۔ قرآن مجید کی پہلی وحی کا آغاز ہی لفظ" اِقْرَأْ "سے ہوا، جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دین کی بنیاد جہالت پر نہیں بلکہ علم و آگاہی پر رکھی گئی ہے۔ اس جواب میں پہلے علم کا مفہوم اور اس کی تعریف واضح کی جائے گی، پھر قرآن مجید کی آیات کی روشنی میں علم کی اہمیت بیان ہوگی اور آخر میں احادیثِ نبوی کی روشنی میں علم اور اہلِ علم کی فضیلت کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

علم کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

لفظ" علم "عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں :جاننا، پہچاننا، کسی شے کی حقیقت سے آگاہ ہونا اور یقین کے ساتھ کسی بات کو معلوم کرنا۔ عربی لغت کی معروف کتاب" لسان العرب "میں علم کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ علم جہل کی ضد ہے، یعنی کسی چیز کو اس کی اصل حقیقت کے مطابق جان لینا۔ علامہ راغب اصفہانی نے" مفردات القرآن" میں لکھا ہے کہ علم کسی شے کی حقیقت کا ادراک ہے۔ امام غزالی کے نزدیک علم وہ صفت ہے جس سے معلوم ہونے والی چیز اس طرح روشن اور واضح ہو جائے کہ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ علم صرف خبر یا اطلاع کا نام نہیں، بلکہ یقین و ادراک کے ساتھ حقیقت تک پہنچنے کا نام ہے۔ جو معلومات اندازے، وہم یا سنی سنائی بات پر مبنی ہوں، وہ علم کے درجے میں نہیں آتیں۔

اصطلاحی طور پر علم سے مراد وہ منظم اور یقینی معلومات ہیں جو دلیل، مشاہدے، تجربے یا وحی کے ذریعے حاصل ہوں اور جن سے انسان صحیح اور غلط، حق اور باطل میں تمیز کر سکے۔ علماء نے علم کی دو بڑی قسمیں بیان کی ہیں :ایک علمِ نافع، یعنی وہ علم جو انسان کے عقیدے، اخلاق، عبادت اور معاشرت کو سنوارتا اور اسے دنیا و آخرت کی فلاح تک پہنچاتا ہے؛ دوسرا وہ علم جو محض معلومات تو دیتا ہے مگر انسان کے کردار اور انجام پر کوئی مثبت اثر نہیں ڈالتا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسی لیے دعا فرمائی تھی" :اے اللہ !میں تجھ سے نفع بخش علم کا سوال کرتا ہوں "اور غیر نافع علم سے پناہ مانگی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں علم کی قدر و قیمت اس کے نفع اور اس کے عمل کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔

علم کی ایک اور تقسیم فرض اور درجے کے اعتبار سے کی جاتی ہے۔ وہ علم جس کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہو، اسے فرضِ عین کہا جاتا ہے، جیسے عقیدے کی بنیادی باتیں، نماز، روزے اور حلال و حرام کے ضروری مسائل۔ اور وہ علم جس کا حاصل کرنا پوری امت کی اجتماعی ذمہ داری ہو، اسے فرضِ کفایہ کہتے ہیں، جیسے طب، انجینئرنگ، فلکیات اور دیگر سائنسی و فنی علوم۔ اگر معاشرے کے کچھ لوگ یہ علوم حاصل کر لیں تو سب کی طرف سے فرض ادا ہو جاتا ہے، لیکن اگر کوئی بھی نہ سیکھے تو سب گنہگار ہوتے ہیں۔ یہ تقسیم اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام دینی اور دنیوی دونوں قسم کے علوم کو ضروری سمجھتا ہے اور کسی مفید علم کو دین سے خارج نہیں کرتا۔

قرآن مجید کی روشنی میں علم کی اہمیت

قرآن مجید میں" علم "اور اس کے مشتقات سینکڑوں مقامات پر استعمال ہوئے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتابِ ہدایت میں علم کو کس قدر مرکزی مقام حاصل ہے۔ وحی کی ابتدا ہی سورۃ العلق کی ان آیات سے ہوئی" :پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم سے سکھایا، انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ "ان آیات میں پڑھنے، قلم اور سکھانے کا ذکر باہم پیوست ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے اعلان فرما دیا کہ انسان کی ترقی کا راستہ علم و قلم ہی سے ہو کر گزرتا ہے۔ قلم کو تعلیم کا ذریعہ قرار دے کر کتابت اور تحریر کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

قرآن مجید نے علم رکھنے والوں اور نہ رکھنے والوں کے درمیان واضح فرق بیان کیا ہے۔ سورۃ الزمر میں ارشاد ہے" :کہہ دیجیے :کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہو سکتے ہیں؟ "یہ استفہام درا صل انکار کے لیے ہے، یعنی عالم اور جاہل ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح سورۃ المجادلہ میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان اور اہلِ علم کے درجات بلند کرنے کا وعدہ فرمایا ہے" :اللہ تم میں سے ایمان لانے والوں اور علم دیے جانے والوں کے درجے بلند فرمائے گا۔ "حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت فرشتوں پر علم ہی کی بنیاد پر ثابت ہوئی، جب اللہ تعالیٰ نے انہیں تمام چیزوں کے نام سکھائے اور فرشتوں نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کیا۔ اس واقعے سے یہ اصول ملتا ہے کہ انسان کی بزرگی اور خلافت کا استحقاق اس کے علم ہی کی وجہ سے ہے۔

قرآن مجید بار بار انسان کو غور و فکر، تدبر اور مشاہدے کی دعوت دیتا ہے۔ کائنات کی نشانیوں پر غور کرنے، زمین و آسمان کی تخلیق میں سوچنے اور گذشتہ قوموں کے انجام سے عبرت لینے کے احکامات اسی لیے دیے گئے ہیں کہ علم مشاہدے اور غور ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں نبی کریم ﷺ کو یہ دعا سکھائی گئی" :اے میرے رب !میرے علم میں اضافہ فرما۔ "غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن نے مال، اولاد یا اقتدار میں اضافے کی دعا اس صراحت سے نہیں سکھائی، جتنی صراحت سے علم میں اضافے کی دعا سکھائی گئی ہے۔ اسی طرح سورۃ فاطر میں فرمایا گیا کہ اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف علماء ہی حقیقی معنوں میں ڈرتے ہیں، کیونکہ جو شخص اللہ کی قدرت اور اس کی نشانیوں کو جتنا زیادہ جانتا ہے، اس کے دل میں اللہ کی عظمت اور خشیت اتنی ہی بڑھتی ہے۔

احادیثِ نبوی کی روشنی میں علم کی فضیلت

احادیثِ نبوی میں علم اور اہلِ علم کی فضیلت بہت تفصیل سے بیان ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا" :علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔) "سنن ابن ماجه (اس حدیث نے علم کو اختیاری مشغلے کے بجائے دینی فریضہ قرار دے دیا۔ ایک اور حدیث میں فرمایا" :جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتا ہے، فرشتے طالبِ علم کی رضا کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں، آسمانوں اور زمین کی تمام مخلوقات حتیٰ کہ پانی کی مچھلیاں بھی عالم کے لیے مغفرت کی دعا کرتی ہیں، اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر۔ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔) "سنن ابی داؤد، ترمذی (انبیاء علیہم السلام نے درہم و دینار نہیں چھوڑے بلکہ علم ورثے میں چھوڑا ہے، پس جس نے علم حاصل کیا اس نے پورا حصہ پا لیا۔

نبی کریم ﷺ نے علم کو ایسی دولت قرار دیا جو انسان کی موت کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ حدیثِ مبارکہ ہے" :جب انسان وفات پا جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے :صدقہ جاریہ، وہ علم جس سے نفع اٹھایا جاتا رہے، اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرے۔) "صحیح مسلم (اسی طرح فرمایا گیا کہ جس شخص سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ اسے چھپائے، قیامت کے دن اسے آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ اس سے علم کی اشاعت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ علم چھپانے کی چیز نہیں بلکہ پھیلانے کی امانت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ میں مسجدِ نبوی کو تعلیم کا مرکز بنایا، اہلِ صفہ کا ادارہ قائم کیا، مختلف قبائل میں معلمین بھیجے اور خود معلم بن کر تشریف لائے، چنانچہ فرمایا" :میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ "غزوہِ بدر کے قیدیوں کی رہائی کے عوض مدینے کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا بھی اسی علمی اہمیت کا عملی ثبوت ہے۔

احادیث میں علم کے ساتھ عمل کی شرط بھی پوری وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ وہ علم جو عمل سے خالی ہو، قیامت کے دن انسان کے خلاف حجت بنے گا۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے" علم لا ینفع "یعنی غیر نافع علم سے پناہ مانگی۔ مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ جب تک امت نے اس قرآنی و نبوی رہنمائی پر عمل کیا، وہ علم کی امامت کرتی رہی؛ بغداد، قرطبہ، دمشق اور سمرقند علم کے مراکز بنے، اور جب علم سے غفلت برتی گئی تو زوال کا شکار ہو گئی۔ آج بھی امت کی نشاۃِ

ثانیہ کا راستہ اسی علم کی طرف رجوع ہی سے ممکن ہے جس کی اہمیت قرآن و حدیث نے اس قدر زور دے کر بیان فرمائی ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ علم کسی شے کی حقیقت کو یقین و ادراک کے ساتھ جاننے کا نام ہے، اور اسلام نے اسے عبادت، فریضہ اور فلاحِ دارین کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ قرآن مجید نے پہلی وحی سے لے کر سینکڑوں آیات تک علم، قلم، غور و فکر اور اہلِ علم کے درجات کی بلندی کا اعلان کیا، اور احادیثِ نبوی نے طالبِ علم کے لیے جنت کی راہ کی آسانی اور علماء کی انبیاء کی وراثت جیسی عظیم فضیلتیں بیان کیں۔ البتہ یہ بھی واضح رہے کہ اسلام میں معتبر علم وہی ہے جو نافع ہو اور عمل سے جڑا ہو۔ اس لیے ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ ضروری دینی علم فرض سمجھ کر حاصل کرے، مفید دنیوی علوم میں مہارت پیدا کرے اور حاصل کردہ علم کو اللہ کی مخلوق کی خدمت اور معاشرے کی بھلائی میں استعمال کرے۔

سوال نمبر2 ۔ اسلام اور سائنس کے باہمی تعلق کو واضح کریں۔ نیز، قرآنِ حکیم کے سائنسی طریقِ کار پر ایک نوٹ تحریر کریں۔ 20) نمبر(

تعارف

اسلام اور سائنس کے باہمی تعلق کا سوال جدید دور کے اہم فکری مباحث میں سے ہے۔ کچھ حلقے دین اور سائنس کو ایک دوسرے کی ضد سمجھتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے کبھی عقل، مشاہدے اور تحقیق کی مخالفت نہیں کی بلکہ انسان کو کائنات کے مطالعے کی باقاعدہ ترغیب دی ہے۔ سائنس مادّی کائنات کے قوانین دریافت کرنے کا نام ہے اور اسلام اس کائنات کے خالق کی طرف سے نازل کردہ ہدایت ہے؛ خالق اور اس کی بنائی ہوئی کائنات کے درمیان تصادم ممکن نہیں۔ اس جواب میں پہلے اسلام اور سائنس کے تعلق کی نوعیت واضح کی جائے گی، پھر قرآنِ حکیم کے اس سائنسی طریقِ کار پر نوٹ پیش کیا جائے گا جس نے مسلمانوں کو تحقیق کی راہ دکھائی اور جس کی بنیاد پر مسلم سائنسدانوں نے صدیوں تک دنیا کی علمی قیادت کی۔

اسلام اور سائنس کے تعلق کی نوعیت

اسلام اور سائنس کے تعلق کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے دونوں کے دائرہ کار کو الگ کرنا ضروری ہے۔ سائنس کا دائرہ مادّی عالم ہے؛ وہ بتاتی ہے کہ کوئی واقعہ" کیسے "پیش آتا ہے، جبکہ دین انسان کو یہ بتاتا ہے کہ کائنات" کیوں "بنائی گئی، اس کا خالق کون ہے اور انسان کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ سائنس" کیسے "کے سوال کا جواب دیتی ہے اور دین "کیوں "کے سوال کا۔ جب دونوں اپنے اپنے دائرے میں رہیں تو ان میں کوئی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے کائنات کو اللہ کی نشانیاں) آیات (قرار دیا ہے جس طرح قرآن کو بھی آیات کہا گیا ہے۔ گویا ایک کتابِ منزل ہے اور دوسری کتابِ کائنات؛ دونوں کا ماخذ ایک ہے، اس لیے دونوں میں ہم آہنگی فطری ہے۔

اسلام نے سائنس کی راہ میں وہ رکاوٹیں بھی ختم کر دیں جو تحقیق کے لیے مہلک تھیں۔ توحید کے عقیدے نے انسان کو ستاروں، سورج، چاند اور فطرت کی دیگر قوتوں کی پرستش سے آزاد کر دیا اور انہیں مسخر اور قابلِ تحقیق مخلوق قرار دیا۔ جب سورج اور چاند کو معبود کے بجائے اللہ کی مخلوق اور انسان کے لیے مسخر سمجھا گیا تب ہی ان کا علمی مطالعہ ممکن ہوا۔ اسی طرح اسلام نے توہم پرستی، کہانت اور جادو ٹونے کی تردید کر کے عقل و مشاہدے کی راہ ہموار کی۔ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں جہاں مذہب کے نام پر تحقیق کو دبایا گیا، وہیں مسلمانوں کے یہاں مساجد کے ساتھ مدرسے، رصد گاہیں اور شفاخانے قائم ہوئے۔ یہ سب اس بات کا ثبوت ہے کہ اصل اسلام سائنس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

قرآنِ حکیم کا سائنسی طریقِ کار

قرآنِ حکیم سائنس کی کتاب نہیں ہے؛ وہ ہدایت کی کتاب ہے۔ لیکن اس نے تحقیق کا جو طریقِ کار انسان کو سکھایا وہ خالص سائنسی طرزِ فکر ہے۔ اس طریقِ کار کا پہلا اصول مشاہدہ ہے۔ قرآن بار بار کہتا ہے" :کیا وہ دیکھتے نہیں؟"،" کیا وہ زمین میں سیر نہیں کرتے؟"،" آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ "یہ آیات انسان کو آنکھ بند کر کے مان لینے کے بجائے کھلی آنکھ سے کائنات کا مطالعہ کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ سائنس کی بنیاد بھی مشاہدے ہی پر ہے۔ دوسرا اصول غور و فکر اور تدبر ہے؛ قرآن نے" اولو الالباب "یعنی عقل والوں کی یہ صفت بیان کی کہ وہ کھڑے، بیٹھے اور لیٹے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں و زمین کی تخلیق میں غور کرتے ہیں۔

تیسرا اصول دلیل طلب کرنا ہے" :کہہ دیجیے :اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو — "یہ دعویٰ بغیر دلیل قبول نہ کرنے کا سائنسی رویہ ہے۔

قرآن کے طریقِ کار کا چوتھا اصول یہ ہے کہ وہ انسانی علم کی محدودیت کا اعتراف کرتا ہے اور تحقیق کو کبھی بند نہیں کرتا۔ فرمایا گیا" :تمہیں علم میں سے بہت تھوڑا دیا گیا ہے۔ "یہ آیت محقق کو عاجزی سکھاتی ہے اور نئی دریافتوں کے دروازے کھلے رکھتی ہے۔ پانچواں اصول تسخیرِ کائنات کا تصور ہے؛ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزوں کو انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ اس تصور نے مسلمانوں کو فطرت کے قوانین دریافت کر کے ان سے فائدہ اٹھانے کی تحریک دی۔ اسی قرآنی طرزِ فکر کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے تجرباتی سائنس کی بنیاد رکھی :ابن الہیثم نے بصریات میں تجربے کا طریقہ اختیار کیا، البیرونی نے زمین کا محیط ناپا اور طبعی مظاہر کی پیمائش میں تجربے کو لازم قرار دیا، جابر بن حیان نے کیمیا کو تجربہ گاہ سے جوڑ دیا اور الخوارزمی نے ریاضی کے منظم اصول وضع کیے۔

اختلاف کے اسباب اور ان کا حل

بعض اوقات قرآن اور سائنس کے درمیان اختلاف کا تاثر پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کی وجوہات پر غور کریں تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ سائنسی نظریات متغیر ہوتے ہیں؛ جو کل قطعی سمجھا جاتا تھا وہ آج رد ہو جاتا ہے، جبکہ قرآن کا متن ثابت اور محفوظ ہے۔ لہٰذا کسی وقتی سائنسی مفروضے کو بنیاد بنا کر قرآن پر اعتراض کرنا درست نہیں۔ دوسری وجہ قرآن کی زبان کا اسلوب ہے؛ قرآن عام انسانوں کی زبان میں خطاب کرتا ہے اور مظاہر کو مشاہداتی انداز میں بیان کرتا ہے، جیسے سورج کا طلوع و غروب ہمارے مشاہدے کے مطابق کہا جاتا ہے حالانکہ سائنسی حقیقت زمین کی گردش ہے۔ یہ اسلوبی بات ہے، سائنسی غلطی نہیں۔ تیسری وجہ یہ کہ بعض مفسّرین یا بعض سائنسدان دونوں طرف سے حد سے تجاوز کرتے ہیں۔ درست رویہ یہ ہے کہ قطعی قرآنی نص اور قطعی سائنسی حقیقت میں کبھی ٹکراؤ نہیں ہو سکتا؛ جہاں اختلاف نظر آئے وہاں یا سائنس کا دعویٰ ابھی مفروضے کا درجہ رکھتا ہے یا قرآن کی وہ تفسیر محلِ نظر ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام اور سائنس کے درمیان کوئی حقیقی تصادم نہیں۔ اسلام نے توحید کے ذریعے کائنات کو پرستش سے نکال کر تحقیق کے قابل بنایا، عقل و مشاہدے کو عزت دی اور انسان کو تسخیرِ کائنات کی ترغیب دی۔ قرآنِ حکیم نے اگرچہ سائنس کی درسی کتاب بننے کا دعویٰ نہیں کیا، مگر مشاہدہ، غور و فکر، دلیل طلبی اور علم کی محدودیت کا اعتراف جیسے اصول دے کر سائنسی طریقِ کار کی بنیاد فراہم کر دی، جس پر چل کر مسلمانوں نے صدیوں سائنسی دنیا کی قیادت کی۔ آج مسلمانوں کو دوبارہ اسی قرآنی رویّے کو اپنانا ہے :دین کی رہنمائی میں سائنسی تحقیق کو فروغ دینا، کیونکہ دونوں کا مقصد حق کی تلاش اور انسانیت کی خدمت ہے۔

سوال نمبر3 ۔ برصغیر کے مسلمانوں کے نمایاں علمی کارناموں کو اجاگر کریں۔ خاص طور پر فنِ حدیث میں یہاں کے علماء کی خدمات کا گہرائی سے جائزہ لیں۔ 20) نمبر(

تعارف

برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد کے ساتھ ہی علم و فن کی وہ روایت قائم ہوئی جس نے اس خطے کو دین، ادب، فلسفہ، طب، ریاضی اور فنونِ لطیفہ کا مرکز بنا دیا۔ سندھ میں عربوں کی آمد سے لے کر مغل دور اور پھر برطانوی دور تک مسلمانوں نے یہاں مدارس، کتب خانے، خانقاہیں اور علمی مراکز قائم کیے۔ برصغیر کے علماء نے فقہ، تفسیر، منطق، فلسفہ، عربی و فارسی ادب اور اردو زبان کی ترویج میں ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ اس جواب میں مسلمانوں کے عمومی علمی کارناموں کا جائزہ لینے کے بعد فنِ حدیث میں برصغیر کے علماء کی خدمات کا خصوصی اور گہرا مطالعہ پیش کیا جائے گا، کیونکہ حدیث کا جو احیاء یہاں ہوا وہ دنیا بھر میں مثال رکھتا ہے۔

برصغیر کے مسلمانوں کے عمومی علمی کارنامے

برصغیر میں مسلمانوں کی علمی خدمات کا آغاز فاتحین کے ساتھ آنے والے علماء اور صوفیاء سے ہوا۔ دہلی سلطنت کے دور میں دہلی، اجمیر، ملتان اور لاہور علم کے مراکز بنے۔ صوفیائے کرام جیسے حضرت داتا گنج بخش نے" کشف المحجوب " جیسی کتاب لکھ کر تصوف کی پہلی باقاعدہ فارسی کتاب اسی سرزمین سے دی۔ نظام الدین اولیاء اور دیگر مشائخ کی

خانقاہیں علم و تربیت کی درسگاہیں تھیں۔ مغل دور میں اکبر، جہانگیر اور اورنگزیب کے ادوار میں فارسی و عربی ادب، تاریخ نویسی اور فقہ کو فروغ ملا۔ اورنگزیب کے حکم پر مرتب ہونے والا" فتاویٰ عالمگیری "فقہِ حنفی کا عظیم ذخیرہ ہے جس کی تدوین میں بڑے بڑے علماء شریک ہوئے۔ اسی دور میں ملّا نظام الدین سہالوی نے" درسِ نظامی "کے نام سے وہ نصاب مرتب کیا جو آج تک دینی مدارس میں رائج ہے اور جس نے منطق، فلسفہ، فقہ اور اصولِ فقہ کی تدریس کو منظم شکل دی۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے علمی احیاء کی عظیم تحریک چلائی۔ انہوں نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کیا تاکہ عوام تک قرآن کا مفہوم پہنچے، ان کے صاحبزادوں شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین نے اردو ترجمہ کیا۔ ان کی کتاب" حجۃ اللہ البالغہ "اسلامی معاشیات، سماجیات اور اسرارِ شریعت پر دنیا بھر میں مانی جانے والی تصنیف ہے۔ انیسویں صدی میں سرسید احمد خان نے علی گڑھ تحریک کے ذریعے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف راغب کیا اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جو بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بنا۔ دارالعلوم دیوبند(1866) ء (اور ندوۃ العلماء لکھنؤ جیسے اداروں نے دینی تعلیم کو منظم کیا۔ اردو ادب میں مسلمانوں نے شاعری، نثر، تنقید، سوانح اور ناول میں وہ سرمایہ پیدا کیا جس نے اردو کو عالمی زبانوں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ علامہ اقبال نے فلسفہ اور شاعری کے امتزاج سے پوری امت کو فکری بیداری کا پیغام دیا۔

فنِ حدیث میں برصغیر کے علماء کی خدمات

برصغیر میں فنِ حدیث کی باقاعدہ بنیاد شیخ عبدالحق محدث دہلوی) متوفی1052 ھ (نے رکھی۔ انہوں نے حجاز میں علم حاصل کر کے دہلی میں حدیث کی تدریس کا آغاز کیا اور" مشکاۃ المصابیح "کی شرح" لمعات التنقیح "اور" اشعۃ اللمعات "لکھی۔ ان سے پہلے برصغیر میں فقہ کا غلبہ تھا اور حدیث کا درس محدود تھا؛ انہوں نے حدیث کو یہاں مستقل علم کی حیثیت دی۔ ان کے بعد شاہ ولی اللہ نے حدیث کی اشاعت کو تحریک کی شکل دی۔ انہوں نے مدینہ منورہ میں شیخ ابوطاہر کردی سے حدیث کی تعلیم حاصل کی، صحیحین اور مؤطا امام مالک کا درس عام کیا اور مؤطا کی دو شروح" المصفّی "اور" المسوّی "لکھیں۔ ان کا ترجمہ و درس اس قدر مقبول ہوا کہ دہلی کا مدرسہ رحیمیہ حدیث کا

عالمی مرکز بن گیا۔ شاہ ولی اللہ نے حدیث اور فقہ میں اعتدال کی راہ دکھائی اور" الانصاف "اور" عقد الجید "میں ائمہ کے اختلافات کے اسباب و آداب پر علمی بحث کی۔

شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنے والد کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کی کتاب" تحفہ اثنا عشریہ "اپنے موضوع پر لاجواب ہے اور" بستان المحدثین "میں انہوں نے محدثین کے حالات جمع کیے۔ شاہ اسماعیل شہید نے" تقویۃ الایمان "لکھ کر عوام میں توحید و سنت کی اشاعت کی۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں حدیث کی خدمت کا تسلسل دیوبند اور دیگر مدارس سے جاری رہا۔ مولانا انور شاہ کشمیری کو ان کی حافظہ و تحقیق کی بنا پر "چلتی پھرتی لائبریری "کہا جاتا تھا؛ ان کی تقاریر" فیض الباری "کے نام سے صحیح بخاری کی عظیم شرح ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے" امداد الفتاویٰ "سمیت سیکڑوں کتابیں لکھیں، مولانا ظفر احمد عثمانی نے" اعلاء السنن "میں احادیثِ احکام کو جمع کیا، مفتی محمد شفیع اور دیگر علماء نے تفسیر و حدیث کے خزانے امت کو دیے۔ مولانا سرفراز خان صفدر، مولانا محمد تقی عثمانی اور بہت سے علماء نے حدیث کی شروح، تخریج اور تحقیق کا کام جدید دور میں بھی جاری رکھا۔

برصغیر کے محدثین کی خدمات صرف تدریس و تصنیف تک محدود نہیں رہیں۔ انہوں نے حدیث کی کتابوں کے اردو تراجم کیے جن سے عام پڑھا لکھا طبقہ براہِ راست حدیث سے جُڑ گیا، احادیث کی تخریج و تحقیق کے اصولوں پر کام کیا، موضوع اور ضعیف روایات کی نشان دہی کی، اور حدیث کی حفاظت کے لیے اسناد کی روایت کو زندہ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ عالمِ اسلام میں یہ مقولہ مشہور ہوا کہ اگر برصغیر کے علماء کی حدیثی خدمات نہ ہوتیں تو علمِ حدیث کا سرمایہ ناقص رہ جاتا۔ عرب علماء نے بھی یہاں کے محدثین کی تحقیق کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی شروح سے استفادہ کیا۔ یوں برصغیر محض حدیث کا صارف نہیں رہا بلکہ اس کا خادم، محقق اور ناشر بن گیا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے علم کے ہر شعبے میں گراں قدر خدمات انجام دیں :درسِ نظامی کا نصاب، فتاویٰ عالمگیری کی تدوین، شاہ ولی اللہ کی فکری تحریک، سرسید کی جدید تعلیمی جدوجہد اور اردو ادب کی عظیم روایت اس کے روشن ابواب ہیں۔ لیکن فنِ حدیث میں ان کی خدمات سب سے نمایاں ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی

نے بنیاد رکھی، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز نے اسے تحریک بنایا اور دیوبند سمیت بعد کے اداروں نے اسے علمی صنعت کی صورت دی۔ تراجم، شروح، تخریج اور تدریس کے ذریعے برصغیر کے علماء نے حدیث کے خزانے کو محفوظ بھی کیا اور عام بھی کیا۔ یہ سرمایہ آج کی نسل کے لیے مشعلِ راہ ہے کہ علم کی خدمت ہی قوموں کی اصل میراث ہوتی ہے۔

سوال نمبر4 ۔ اصولِ دین میں پائے جانے والے اختلافات کی بنیادی وجوہات کیا ہیں؟ اس موضوع پر ایک جامع نوٹ لکھیں۔ 20) نمبر(

تعارف

اسلام کے بنیادی عقائد یعنی توحید، رسالت، آخرت اور دیگر ارکانِ ایمان پر پوری امت کا اتفاق ہے، لیکن جب ہم اصولِ دین یعنی علمِ کلام اور اعتقادی مسائل کی تفصیلات میں جاتے ہیں تو مختلف مکاتبِ فکر نظر آتے ہیں :اشاعرہ، ماتریدیہ، معتزلہ، خوارج، شیعہ اور اہلِ حدیث وغیرہ۔ یہ اختلافات بعض اوقات تفرقے اور شدت کا سبب بھی بنے ہیں۔ ان اختلافات کو سمجھنے کے لیے ان کی بنیادی وجوہات کا جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو کہ یہ اختلاف کہاں علمی اور فطری ہے اور کہاں اس نے اصل مقصد سے ہٹ کر شدت پسندی کی شکل اختیار کی۔ اس نوٹ میں اختلاف کی تعریف و اقسام کے بعد اس کی بنیادی وجوہات اور ان کے نتائج و حل پر جامع بحث کی جائے گی۔

اختلاف کی نوعیت اور اقسام

اصولِ دین سے مراد وہ اعتقادی مسائل ہیں جن کا تعلق ایمان کی بنیادوں سے ہے، جیسے ذات و صفاتِ باری تعالیٰ، قضا و قدر، ایمان کی تعریف، نبوت، معجزات، اور متعلقہ کلامی مسائل۔ ان میں پایا جانے والا اختلاف دو قسم کا ہے :ایک وہ اختلاف جو نصوص کی تعبیر و تشریح میں اجتہاد کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور جس میں ہر فریق کے پاس دلیل ہوتی ہے؛ دوسرا وہ اختلاف جو محض ہٹ دھرمی، گروہ بندی یا سیاسی مفادات کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور جو امت کی وحدت کے لیے نقصان دہ ہے۔ پہلی قسم کا اختلاف اسلام کی علمی تاریخ کا حصہ رہا ہے اور خود صحابہ کرام کے دور میں بھی اجتہادی اختلافات پائے جاتے تھے، لیکن وہ اخلاص پر مبنی تھے اور تفرقے کا سبب نہیں بنے۔ اصل مسئلہ دوسری قسم کے اختلاف کا ہے جو شدت اور تکفیر تک پہنچ جاتا ہے۔

اختلافات کی بنیادی وجوہات

اختلاف کی پہلی اور بنیادی وجہ نصوص کی دوہری حیثیت ہے۔ قرآن و حدیث کے بعض دلائل قطعی الثبوت و قطعی الدلالہ ہیں جن میں اختلاف ممکن نہیں، لیکن بعض نصوص ظنی الدلالہ ہیں، یعنی ان میں ایک سے زیادہ معانی کا احتمال ہوتا ہے، خاص طور پر صفاتِ الٰہی سے متعلق متشابہ آیات۔ ان آیات کی تاویل میں کسی نے ظاہر کو لیا، کسی نے تاویل کی اور کسی نے تفویض اختیار کی، یوں اشعری، ماتریدی اور سلفی تعبیرات وجود میں آئیں۔ دوسری بڑی وجہ عقل و نقل کے باہمی تعلق کا اختلاف ہے :معتزلہ نے عقل کو مقدم رکھا، اہلِ ظاہر نے نقل کو، اور اشاعرہ و ماتریدیہ نے دونوں میں توازن قائم کرنے کی کوشش کی۔ ایمان کی تعریف، صفات کی تاویل اور قدر کے مسئلے میں اختلاف کی جڑ یہی فکری اختلاف ہے۔

تیسری وجہ انسانی فہم اور پس منظر کا اختلاف ہے۔ ہر عالم اپنے ماحول، استاذہ، زبان اور مزاج کے اثر سے نص کو سمجھتا ہے۔ لغتِ عربی کے الفاظ کے متعدد معانی بھی اختلاف کا سبب بنتے ہیں۔ چوتھی وجہ سیاسی عوامل ہیں۔ خلافت اور جانشینی کے سوال نے ابتدائی دور ہی میں امت کو فکری گروہوں میں تقسیم کیا؛ خوارج کا ظہور جنگِ صفین کے تحکیمی واقعے سے جڑا ہے۔ اسی طرح مختلف ادوار میں حکمرانوں کی سرپرستی نے بعض مکاتب کو فروغ دیا اور بعض کو دبایا، جس سے علمی اختلاف سیاسی رنگ اختیار کر گیا۔ پانچویں وجہ خارجی اثرات ہیں :جب یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا تو منطق و فلسفے کے سوالات ایمانیات میں داخل ہو گئے۔ معتزلہ نے فلسفیانہ اسلوب اپنایا، پھر اس کے رد میں اشعری و ماتریدی کلام وجود میں آیا۔ یہودی، عیسائی اور دیگر مذاہب کے ساتھ مناظروں نے بھی ایسے سوالات پیدا کیے جن پر امت میں بحث چھڑ گئی، جیسے خلقِ قرآن کا مسئلہ جو مامون کے دور میں ریاستی فتنہ بن گیا۔

چھٹی وجہ اجتہاد کا فطری تقاضا ہے۔ شریعت نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے، اور جہاں مجتہدین ہوں گے وہاں رائے کا اختلاف لازمی ہوگا۔ اسی لیے امام شافعی نے فرمایا تھا کہ میری رائے درست ہے مگر غلطی کا احتمال رکھتی ہے اور دوسرے کی رائے غلط ہے مگر درست ہونے کا احتمال رکھتی ہے۔ ساتویں وجہ بعض روایات کی صحت و ضعف کے بارے میں محدثین کا اختلاف بھی ہے؛ جس روایت کو ایک فریق صحیح سمجھتا ہے دوسرا اسے ضعیف کہتا ہے، اور اسی پر

اعتقادی نتیجہ مختلف ہو جاتا ہے۔ ان اسباب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اعتقادی اختلافات کا بڑا حصہ علمی اور اصولی ہے، نہ کہ محض ضد و عناد۔

اختلاف کے اثرات اور اتحاد کی راہ

ان اختلافات کے مثبت اثرات یہ ہوئے کہ علمِ کلام، اصولِ فقہ اور منطق جیسے علوم پروان چڑھے، عقائد کی تدوین ہوئی اور اسلام کے خلاف اٹھنے والے فکری حملوں کا مدلل جواب دیا گیا۔ لیکن منفی اثرات بھی کم نہیں :گروہی عصبیت پیدا ہوئی، تکفیر کا رجحان بڑھا، عام آدمی الجھن کا شکار ہوا اور امت کی قوت اندرونی لڑائیوں میں ضائع ہوئی۔ اس کا حل قرآن نے یہ دیا ہے کہ اختلاف کی صورت میں معاملہ اللہ اور رسول کی طرف لوٹایا جائے، اور اہلِ علم سے یہ توقع رکھی گئی کہ وہ اختلاف کے آداب ملحوظ رکھیں :اخلاص، انصاف، مخالف کی دلیل کا احترام اور ذاتیات سے اجتناب۔ شاہ ولی اللہ نے" الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف "میں یہی رہنمائی دی کہ اختلاف کے اسباب کو سمجھ لیا جائے تو دل میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ بنیادی عقائد میں اتحاد اور جزئی مسائل میں وسعتِ ظرف ہی امت کی وحدت کا راستہ ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اصولِ دین میں اختلافات کی بنیاد کسی ایک سبب پر نہیں بلکہ کئی اسباب پر ہے :نصوص کا ظنی الدلالہ ہونا، متشابہ آیات کی تعبیر، عقل و نقل کا تناسب، لغوی احتمالات، سیاسی حالات، یونانی فلسفے اور دیگر مذاہب کے خارجی اثرات، اجتہاد کی فطری گنجائش اور روایات کی صحت میں اختلاف۔ یہ اختلاف اپنی علمی صورت میں دین کی فکری زندگی کا ثبوت رہے ہیں اور ان سے عظیم علوم وجود میں آئے، لیکن جب یہ عصبیت، تکفیر اور تفرقے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو امت کے لیے زہر بن جاتے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اتفاقی اصولوں پر مضبوطی سے جمع ہوا جائے، اختلافی مسائل کو اہلِ علم کی بحث تک محدود رکھا جائے اور اختلاف کے قرآنی آداب کو ہر حال میں ملحوظ رکھا جائے۔

سوال نمبر5 ۔ دورِ تابعیین میں تفسیری مراکز اور ان کی تفسیری خصوصیات پر ایک مفصل نوٹ قلمبند کریں۔ 20) نمبر(

تعارف

تفسیرِ قرآن کا آغاز خود عہدِ رسالت سے ہوتا ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ قرآن کے اولین مفسّر تھے۔ صحابہ کرام نے آپ ﷺسے تفسیر سیکھی اور پھر تابعیین کی نسل نے صحابہ سے یہ علم حاصل کر کے اسے اگلی صدیوں تک منتقل کیا۔ دورِ تابعیین) پہلی صدی ہجری کے آخر سے دوسری صدی کے اوائل تک (میں اسلامی دنیا کے مختلف شہروں میں تفسیر کے بڑے بڑے مراکز قائم ہو گئے، جن میں سے ہر مرکز کا اپنا مزاج اور اپنی خصوصیات تھیں۔ ان مراکز کی اہمیت یہ ہے کہ آج تک موجود تقریباً تمام قدیم تفاسیر کی اسانید انہی مراکز تک پہنچتی ہیں۔ اس نوٹ میں مکہ، مدینہ، کوفہ، بصرہ، شام، یمن اور مصر کے تفسیری مراکز اور ان کی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مراکز

مکہ کا تفسیری مرکز سب سے مشہور ہے، جس کے بانی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، جنہیں" ترجمان القرآن "کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ !اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور تاویل کی تعلیم دے۔ ابن عباس کے شاگردوں میں مجاہد بن جبر، عکرمہ، طاؤس بن کیسان، سعید بن جبیر اور عطاء بن ابی رباح شامل ہیں، جن کے اقوال آج بھی ہر تفسیر میں ملتے ہیں۔ مکہ کے مرکز کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں تفسیر میں لغتِ عرب، اشعارِ عرب اور اسبابِ نزول سے بہت استفادہ کیا جاتا تھا، کیونکہ اہلِ مکہ عربی زبان کے اصل وارث تھے۔ مجاہد نے اپنی تفسیر تین مرتبہ ابن عباس کے سامنے پیش کی اور ہر آیت کے بارے میں استفسار کیا، اس لیے ان کی روایت تفسیر بالماثور کی معتبر ترین صورتوں میں گنی جاتی ہے۔

مدینہ منورہ کا مرکز اپنی نوعیت میں الگ تھا۔ یہاں کے مفسّرین میں زید بن اسلم، ابو العالیہ رُفیع بن مہران اور محمد بن کعب قرظی نمایاں ہیں، اور اس مرکز کی بنیاد حضرت اُبیّ بن کعب اور حضرت زید بن ثابت جیسے صحابہ کی روایت پر تھی۔ مدینہ دارِ ہجرت اور وحی کا شہر تھا، اس لیے وہاں کی تفسیر میں احادیثِ نبوی اور آثارِ صحابہ کا ذخیرہ سب سے

مستند سمجھا جاتا تھا۔ مدنی مرکز کی خصوصیت احتیاط اور روایت پر سختی سے کاربند رہنا تھی؛ یہاں کے علماء قرآن کو حدیث و سنت کی روشنی میں سمجھتے اور رائے سے تفسیر میں انتہائی احتیاط برتتے تھے۔

عراق) کوفہ و بصرہ (کے مراکز

کوفہ کا مرکز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے قائم ہوا، جنہیں وہاں معلم بنا کر بھیجا گیا تھا۔ ان کے شاگردوں میں علقمہ بن قیس، اسود بن یزید، مسروق بن اجدع، عبیدہ سلمانی اور ابراہیم نخعی نمایاں ہیں۔ ابن مسعود قرآن کے بہترین قاری اور مفسّر تھے، چنانچہ کوفے کی تفسیر میں فقہی رنگ غالب آیا۔ کوفہ چونکہ عراق کا صدر مقام اور فوجی چھاؤنی تھا جہاں نئے مسائل کثرت سے پیش آتے تھے، اس لیے یہاں کے مفسّرین نے آیاتِ احکام پر خصوصی توجہ دی اور اجتہاد و استنباط کو روایت کے ساتھ جمع کیا۔ بعض محققین کے نزدیک تفسیر بالرائے کی ابتدائی جھلک اسی مرکز سے ملتی ہے، اگرچہ یہ رائے مأثور کی بنیاد پر ہی ہوتی تھی۔

بصرہ کا مرکز حضرت انس بن مالک اور حضرت ابوموسیٰ اشعری جیسے صحابہ کے فیض سے قائم ہوا۔ یہاں کے مشہور تابعی مفسّرین میں حسن بصری، قتادہ بن دعامہ، محمد بن سیرین اور ابو العالیہ شامل ہیں۔ حسن بصری اپنی زہد و تقویٰ اور فصاحت و بلاغت کے لیے مشہور تھے، ان کی تفسیر میں وعظ و نصیحت اور قلبی کیفیات کا رنگ نمایاں تھا۔ قتادہ حفظ و روایت میں بے مثال تھے اور ان کے تفسیری اقوال بڑی کثرت سے منقول ہیں۔ بصرہ چونکہ مختلف تہذیبوں اور فکری تحریکوں کا سنگم تھا، اس لیے وہاں کی تفسیر میں عقلی مباحث اور نحوی و لغوی باریکیوں کی طرف بھی رجحان پیدا ہوا، جو بعد میں بلاغتی تفسیر کی بنیاد بنا۔

شام، یمن اور مصر کے مراکز

شام کا تفسیری مرکز حضرت معاذ بن جبل، عبادہ بن صامت اور ابو درداء جیسے صحابہ کی تعلیمات سے پروان چڑھا۔ تابعین میں مکحول شامی اور دیگر علماء نے وہاں تفسیر کی روایت کو آگے بڑھایا۔ شامی تفسیر کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں اہلِ کتاب کی روایات اور تاریخی واقعات سے استفادہ نسبتاً زیادہ ملتا ہے، کیونکہ شام میں اہلِ کتاب کی بڑی آبادی موجود تھی اور مسلمانوں کا ان سے روزمرہ کا واسطہ تھا۔ تاہم اسی وجہ سے یہاں اسرائیلیات کے داخل ہونے کے امکانات بھی زیادہ تھے، جس کی طرف بعد کے محدثین نے توجہ دلائی۔

یمن کے مرکز کا تعلق حضرت معاذ بن جبل اور طاؤس بن کیسان کی روایت سے ہے۔ طاؤس اگرچہ ابن عباس کے شاگرد تھے مگر ان کا قیام یمن میں رہا، اس لیے یمنی مرکز مکہ سے جڑا ہوا سمجھا جاتا ہے اور وہاں لغوی و اثری تفسیر کا رنگ غالب رہا۔ مصر میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے فیض سے تفسیر کی روایت قائم ہوئی اور بعد میں یزید بن ابی حبیب جیسے تابعین نے اسے آگے بڑھایا۔ مصر کی تفسیر میں بھی تاریخی روایات کا عنصر نمایاں تھا۔ ان تمام مراکز کا مشترکہ سرمایہ یہ تھا کہ ان کی روایات امام طبری نے اپنی" جامع البیان "میں اسانید کے ساتھ جمع کر دیں، اور بعد کی تمام تفاسیر انہی سے فیضیاب ہوئیں۔

دورِ تابعیین کی تفسیر کی عمومی خصوصیات

اس دور کی تفسیر کی پہلی خصوصیت تفسیر بالماثور پر انحصار ہے۔ قرآن کی تفسیر قرآن سے، پھر حدیث سے، پھر اقوالِ صحابہ سے اور پھر اقوالِ تابعین سے کی جاتی تھی۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ تفسیر کلی کتاب کی صورت میں مدون نہیں تھی، بلکہ یہ اقوال و روایات کی شکل میں سینی بسینہ منتقل ہوتی رہی اور دوسری صدی ہجری میں باقاعدہ تصنیف کا آغاز ہوا، مثلاً مقاتل بن سلیمان اور سفیان ثوری کی تفاسیر۔ تیسری خصوصیت اختلافِ تعبیر کی موجودگی ہے، مگر یہ اختلاف تضاد کا نہیں تنوع کا تھا؛ ایک ہی آیت کے مختلف پہلو بیان ہو جاتے تھے۔ چوتھی خصوصیت اسرائیلیات کی آمیزش ہے جو بعض مراکز میں اہلِ کتاب کے نومسلموں کے ذریعے داخل ہوئی، جس کی وجہ سے بعد کے علماء نے روایات کی چھان بین کا سخت نظام بنایا۔ پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کی تفسیر میں اجتہاد کا آغاز ہو چکا تھا مگر وہ اجتہاد لغت، اسبابِ نزول اور سیاق و سباق کی حدود میں رہتا تھا۔ یہی متوازن روایت تفسیر کے پورے علمی سرمائے کی بنیاد بنی۔

جدول :دورِ تابعیین کے تفسیری مراکز اور ان کی خصوصیات

مرکز	نمایاں تابعی مفسّرین	خاص خصوصیت
مکہ مکرمہ	مجاہد، عکرمہ، طاؤس، سعید بن جبیر	لغت و اشعارِ عرب، اسبابِ نزول، تفسیرِ ابن عباس
مدینہ منورہ	زید بن اسلم، ابو العالیہ، محمد بن کعب	روایت و احتیاط، حدیث و آثار پر

	قرظی	انحصار
کوفہ	علقمہ، مسروق، ابراہیم نخعی	فقہی رنگ، آیاتِ احکام، منضبط اجتہاد
بصرہ	حسن بصری، قتادہ، ابن سیرین	وعظ و زہد، بلاغت، نحوی باریکیاں
شام و یمن	مکحول شامی، طاؤس) یمن(	تاریخی روایات سے استفادہ

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ دورِ تابعیین میں تفسیر کے مراکز پورے عالمِ اسلام میں پھیل گئے :مکہ میں ابن عباس کے مدرسے نے لغوی و اثری تفسیر کی بنیاد رکھی، مدینے نے روایت و احتیاط کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، کوفے نے فقہی و اجتہادی رنگ دیا، بصرے نے وعظ، بلاغت اور عقلی رجحان کو شامل کیا، اور شام، یمن و دیگر علاقوں نے اپنی اپنی ماحولی خصوصیات کے ساتھ اس خزانے کو وسیع کیا۔ ان مراکز کی اسانید اور اقوال امام طبری، ابن ابی حاتم اور دیگر محدثین و مفسّرین کی کتابوں میں محفوظ ہو کر ہم تک پہنچے ہیں۔ تابعیین کی یہ علمی امانت اس بات کا ثبوت ہے کہ تفسیرِ قرآن کا علم خالص علمی تسلسل کے ساتھ منتقل ہوا، اور آج کا طالبِ علم جب ان اقوال کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ گویا عہدِ نبوی سے جڑی ہوئی علمی زنجیر کی کڑیوں کو دیکھتا ہے۔